

تدبر قرآن

٤٩

الزُّرْعَات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ سورہ کا عمود

اس سورہ میں بھی تفریش کے ان متمرّدین کو انداز ہے جو عذاب اور قیامت کو بالکل بعید از امکان محض ایک دھمکی خیال کرتے تھے۔ ہواؤں اور بادلوں کے عجائب و تصرفات شہادت میں پیش کر کے ان کو آگاہ فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے محفوظ نہ سمجھو اور رسول کو جھٹلانے کی جسارت نہ کرو۔ تم اسی وقت تک محفوظ ہو جب تک خدا نے تم کو ہمت دے رکھی ہے۔ جو یہی ہمت ختم ہوئی خدا کی پکڑ میں آ جاؤ گے اور اس کے لیے خدا کو کوئی اتہام نہیں کرنا پڑے گا۔ یہی ہوا میں اور یہی بادل جو ہر جگہ موجود اور تمہاری زندگی کے لیے ناگزیر ہیں، قہر الہی کی شکل اختیار کر لیں گے اور تمہیں جڑ پیر سے اکھاڑ پھینکیں گے۔

تمہیں اور مطالب کے اعتبار سے یہ سورہ، سورہ ذاریات اور سورہ مرسلات سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ دنیا میں خدا کی پکڑ اور اس کی قدرت و ربوبیت کی جو شانیں بالکل نمایاں ہیں وہ اس امر کی نہایت واضح دلیل ہیں کہ ایک المیادن لازماً آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ ان سرکشوں کو سزا دے گا جنہوں نے اس کے حکموں سے سرتابی کی اور ان لوگوں کو اپنی ابدی رحمت سے نوازے گا جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرتے اور اپنی خواہشوں کو لگام لگاتے رہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۵) ہواؤں اور بادلوں کی شہادت اس امر پر کہ اللہ کا رسول دنیا اور آخرت کے جس عذاب سے آگاہ کر رہا ہے اس کا واقع ہونا ذرا بھی مستبعد نہیں ہے۔ جس خدا کے ہاتھ میں ہواؤں اور بادلوں کی باگ ہے وہ ان کو جس کے لیے چاہے رحمت اور جس کے لیے چاہے عذاب بنا دے۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز بھی بعید نہیں ہے۔ دنیا میں رسولوں کے مکتذبین کی جو تاریخ موجود ہے وہ شہادت دیتی ہے کہ ایک دن سب کو اپنے رب کے آگے حساب و کتاب کے لیے پیش ہونا ہے۔

(۶-۱۴) قیامت کی بلحیل اور اس دن اس کے جھٹلانے والوں پر جو گزرے گی اس کی تصویر۔
 (۱۵-۲۶) قریش کے فراعنہ کی تنبیہ کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت کے اتنے حصہ کی یاد دہانی جس کے لیے سورہ کا عمود مقفقی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت ناصحانہ انداز میں فرعون کو راہِ حق پر لانے کی کوشش کی لیکن اس نے اکرٹ دکھائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی پکڑ میں آ گیا۔ اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو کوئی بڑا اہتمام نہیں کرنا پڑا۔ ہواؤں کے معمولی تصرف ہی نے اس کا سارا بیڑا غرق کر دیا۔

(۲۷-۳۳) اس بات کی دلیل کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لوگوں کو از سر نو پیدا کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ جس نے آسمان و زمین پیدا کیے، رات اور دن نمودار کیے، لوگوں کی پرورش کے لیے طرح طرح کے سامان مہیا کیے اس کے لیے لوگوں کو دوبارہ پیدا کر دینا کیا مشکل ہے؟ اس کی قدرت دلیل ہے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے اور اس کی حکمت مقفقی ہے کہ وہ ایسا کرے۔

(۳۴-۴۱) باغیوں اور نافرمانوں کو اس دن جس انجام سے سابقہ پیش آئے گا اس کا بیان۔ ان کے بالمقابل اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو جو صلہ ملے گا اس کی بشارت۔

(۴۲-۴۶) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ جو لوگ تمہیں زچ کرنے کو قیامت کی تاریخ اور اس کے دن کی یا بت سوال کرتے اور اس کے لیے جلدی مچاٹے ہوئے ہیں تم ان کی باتوں کا دھیان نہ کرو۔ قیامت کے دن اور اس کی تاریخ کا معاملہ تم سے متعلق نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دو۔ تم اس کے ظہور کا دن معین کرنے نہیں آئے ہو، بلکہ اس سے لوگوں کو آگاہ کرنے آئے ہو۔ آج جن کو قیامت بہت بعید معلوم ہو رہی ہے جب وہ اس کو دیکھیں گے تو محسوس کریں گے کہ دنیا میں ایک سپر یا ایک دوپہر سے زیادہ نہیں ہے۔

سُورَةُ الزُّرْعَةِ

مَكِّيَّةٌ ————— آيَاتُ: ٢٦

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالزُّرْعَةِ غَرْقًا ① وَالنُّشْطِ نَشْطًا ② وَالسَّبِيحِ
 سَبْحًا ③ فَالسَّبِقِ سَبْقًا ④ فَالْمُدْبِرِ أَمْرًا ⑤ يَوْمَ
 تَرْجِفُ الرَّاجِفَةُ ⑥ تَتَّبِعُهَا الرَّادِفَةُ ⑦ قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ
 وَاجِفَةٌ ⑧ أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ⑨ يَقُولُونَ عَرَانَا لَمَرَدٍ وَدُونَ
 فِي الْعَافِرَةِ ⑩ إِذَا كُنَّا عِظَامًا نَخِرَةً ⑪ قَالُوا تِلْكَ
 إِذَا كَرَّتْ خَاسِرَةٌ ⑫ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ⑬ فَإِذَا
 هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ⑭ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى ⑮ إِذْ نَادَاهُ
 رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ⑯ إِذْ هَبَّ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ
 طَغَى ⑰ فَقُلْ هَلْ لَكَ إِلَى أَنْ تَزَكَّى ⑱ وَاهْدِيكَ إِلَى رَبِّكَ
 فَتَخْشَى ⑲ فَارِبُهُ أَلِيَّةٌ أَكْبَرَى ⑳ فَكَذَّبَ وَعَصَى ㉑ ثُمَّ
 أَدْبَرَ يَسْعَى ㉒ فَحَشَرَ فَنَادَى ㉓ فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى ㉔
 فَآخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَى ㉕ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً
 لِّمَنْ يَخْشَى ㉖ عَرَانَا أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ بِنهَا ㉗ رَفَعَ

آيات
٢٦-١

وقف لازم

وقف لازم

وقف لازم

وقف لازم

سَمَكَهَا فَسَوَّبَهَا ۲۸ ۱ وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ صُحُوحَهَا ۲۹
 وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا ۳۰ ۱ أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَاهَا ۳۱
 وَالْجِبَالَ أَدْسَهَا ۳۲ ۱ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۳۳ ۱ فَإِذَا جَاءَتِ
 الطَّامَّةُ الْكُبْرَى ۳۴ ۱ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعَى ۳۵ ۱ وَ
 بُرِّزَتِ الْجَبْحِيمُ لِمَنْ يَرَى ۳۶ ۱ فَا مَّا مَن طَغَى ۳۷ ۱ وَاتَّخَذَتِ
 الدُّنْيَا ۳۸ ۱ فَإِنَّ الْجَبْحِيمَ هِيَ الْمَأْوَى ۳۹ ۱ وَأَمَّا مَن خَافَ
 مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى ۴۰ ۱ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ
 الْمَأْوَى ۴۱ ۱ يُسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا ۴۲ ۱ فِيمَا
 أَنْتَ مِنْ ذِكْرِهَا ۴۳ ۱ إِلَىٰ رَبِّكَ مُنْتَهَاهَا ۴۴ ۱ إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ
 مَّن يَخْشَاهَا ۴۵ ۱ كَانَهُمْ يَوْمَ يَدُونُهَا كَرُمِلْتُوا إِلَّا عَشِيَّةً
 أَوْ صُحُوحًا ۴۶ ۱

۲

ترجمہ آیات
۴۶-۱

شاہد ہیں جبرطوں سے اکھاڑ پھینکنے والی ہوائیں۔ اور شاہد ہیں آہستہ چلنے

والی ہوائیں اور شاہد ہیں فضاؤں میں تیرنے والے بادل، پھر ایک دوسرے پر
سبقت کرنے والے اور خدا کے حکم نازل کرنے والے (کہ جس چیز سے تمہیں ڈرایا

جا رہا ہے وہ شدنی ہے) ۱-۵

اس دن سے ڈرو جس دن کپکپی پڑے گی۔ اس کے سچھے ایک دوسرا جھٹکا

آئے گا۔ کتنے دل اس دن دھڑکتے ہوں گے۔ ان کی نگاہیں پست ہوں گی۔ ۶-۹

پوچھتے ہیں کیا ہم پھر پہلی حالت میں لوٹائے جائیں گے! کیا جب کہ ہم کھنکھناتی

پڑھیں ہو چکیں گے! کہتے ہیں، یہ لوٹنایا جانا تو بڑے ہی خسارے کا ہوگا!! ۱۰-۱۲
 وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہوگی کہ دفعۃً وہ میدان میں آ موجود ہوں گے۔ ۱۳-۱۴
 کیا موسیٰ کی سرگزشت تمہیں پہنچی ہے؟ جب کہ اس کے رب نے وادی
 مقدس — طوبی — میں اس کو لپکارا کہ تم فرعون کے پاس جاؤ، اس نے بہت
 سراٹھایا ہے۔ اس سے کہو کہ کیا تم میں کچھ اپنے کو سدھارنے کا جذبہ ہے؟
 کیا میں تمہیں تمہارے رب کی راہ دکھاؤں کہ تم اس سے ڈرنے والے بنو؟ پس اس
 کو ایک بڑی نشانی دکھائی تو اس نے جھٹلایا اور بات نہ مانی۔ پھر ٹپا اپنی سرگرمیوں
 کو تیز کرتے ہوئے۔ پس جمع کیا اور اعلان کیا کہ تمہارا رب اعلیٰ تو میں ہوں۔ پس
 اللہ نے اس کو آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑا۔ بے شک اس میں سبق ہے
 ان لوگوں کے لیے جو ڈر رکھنے والے ہیں۔ ۱۵-۲۶

کیا تمہارا بنانا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ اس کو اٹھایا، اس کے
 گنبد کو بلند کیا، پس اس کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ اس کی رات ڈھانک دی اور
 اس کے دن کو بے نقاب کیا اور زمین کو اس کے بعد ہموار کیا۔ نکالا اس سے
 اس کا پانی اور چارہ اور پہاڑوں کو اس میں گاڑا۔ تمہاری اور تمہارے مویشیوں
 کی نفع رسانی کے لیے۔ ۲۷-۳۳

پس جب وہ بڑا ہنگامہ برپا ہوگا (تو یہ سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا)،
 اس دن انسان اپنے کیے کو یاد کرے گا اور دوزخ ان لوگوں کے لیے بے نقاب
 کر دی جائے گی جن کو اس سے دو چار ہونا ہے۔ تو جس نے سرکشی کی اور آخرت

کے با متقابل دنیا کی زندگی کو ترجیح دی اس کا ٹھکانا تو بس جہنم ہی بنے گی۔ اور وہ جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرا اور جس نے اپنے نفس کو خواہش کی پیروی سے روکا تو اس کا ٹھکانا لاریب جنت ہے۔ - ۳۴-۴۱

وہ قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ وہ کب کھڑی ہوگی؟ تم اس بحث میں کہاں پڑے ہو! یہ معاملہ تو تیرے رب کے حوالہ ہے۔ تم تو بس ان لوگوں کو اس سے آگاہ کرنے والے ہو جو اس سے ڈریں۔ جس روز وہ اس کو دیکھیں گے تو گویا انھیں ایک شام یا اس کی صبح سے زیادہ وقفہ نہیں گزرا۔ - ۴۲-۴۶

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالنَّزْعَاتِ غُرْقًا ۚ وَالتَّشْيِطِ نَشْطًا (۱-۲)

’نازعات‘ اور ’ناشطات‘ کی تاویل میں یوں تو متعدد اقوال منقول ہیں لیکن غالب رائے یہ ہے ’نازعات‘ کہ ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کفار کی جانیں سختی سے اور اہل ایمان کی جانیں نہایت نرمی سے نکالتے ہیں۔ سے مراد اگرچہ اس قول کو شہرت حاصل ہے لیکن اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اس باب میں جو روایات ہیں وہ بالکل تفسیری نوعیت کی ہیں۔ جن کا یہ درجہ نہیں ہے کہ ان کی بنیاد پر کوئی بات اعتماد کے ساتھ کہی جاسکے۔ قرآن میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے اس قول کے حق میں کوئی تائید نکلتی ہو۔ اہل کفر اور اہل ایمان کی جانوں کے نکلانے کا معاملہ تمام تر ایک روحانی و باطنی کیفیت سے تعلق رکھنے والا معاملہ ہے، وہ کوئی ایسی عام شاہدے میں آنے والی چیز نہیں ہے کہ اس کو کسی دعوے پر بطور حجت پیش کیا جاسکے دراصل ایک یہ قسمیں یہاں بطور شہادت کھائی گئی ہیں۔ مفسرین کے نزدیک چونکہ ضروری ہے کہ قسم کسی مبارک و مقدس چیز کی ہو اس وجہ سے انہیں ان الفاظ سے فرشتوں کو مراد لینے کا تکلف کرنا پڑا لیکن ہم برابر واضح کرتے آ رہے ہیں کہ قرآن میں قسمیں بالعموم کسی دعوے پر بطور شہادت آئی ہیں۔ ان کے اندر نمایاں پہلو دعوے پر دلیل کا ہوتا ہے۔ اس سے کچھ بخت نہیں کہ جس کی قسم کھائی گئی ہے وہ کوئی مقدس چیز ہے یا غیر مقدس۔

ہمارے نزدیک ’نازعات‘ سے مراد وہ تند ہوائیں ہیں جو درختوں، مکانوں اور گڑھی ہوئی چیزوں کو اپنے زور سے اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ اس طرح کی ہواؤں کی صفت کے طور پر ’نازعات‘ بہر سلات‘ اور ’عاصفات‘ وغیرہ الفاظ بھی قرآن میں استعمال ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ ’ذُرُوقًا‘، ’عُصْفًا‘ اور ’عُصْفًا‘ کے الفاظ بطور تاکید آئے ہیں۔ اسی طرح یہاں لفظ ’نازعات‘ ان تند ہواؤں کے لیے استعمال ہوا ہے جو درختوں اور مکانوں کو اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ اس کے ساتھ لفظ ’عُصْفًا‘ معنی کی شدت کے اظہار کے لیے بطور تاکید ہے۔

قوم عاد پر اللہ تعالیٰ نے بارگاہِ جہنم کا جو عذاب مسلط فرمایا اس کی تصویر سورہ قمر میں یوں کھینچی گئی ہے:

وَاِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَوَّارًا
فِي يَوْمٍ نَحْسٍ مُّسْتَمِرَّةٍ تَرْفَعُ النَّاسَ كَالْهَبِّ
اَعْجَازًا لِّخَلٍّ مُّنْقَعِرَةٍ (القمر- ۱۹: ۵۴-۵۵)

ہم نے ان پر ایک طویل نحوست کے زمانے میں
بادِ صر مسلط کر دی جو لوگوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی
گویا وہ کھوکھلی کھجوروں کے تنے ہوں۔

یہاں فعل تَنْزِعُ استعمال ہوا ہے اسی سے اس سورہ میں 'نازعات' بطور صفت استعمال ہوا ہے۔
 'ناشطات' کسی رسی کی گرہ یا کسی جانور کے بندھن کو چرنے چگنے کے لیے چھوڑ دینے کے معنی میں بھی۔ یہاں قرینہ تبارہ سے مراد ہے کہ یہ نرم ردو اور آہستہ خرام ہواؤں کے لیے آیا ہے جس طرح سورہ ذاریات میں نَالَجِدِيَّتِ لَيْسًا کے الفاظ آئے ہیں۔

یہ امر واضح رہے کہ تند اور نرم ردو ہواؤں کے عمل کی ظاہری نوعیت، اگرچہ الگ تھلک ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے عجائبات تصرف کی شانیں دونوں کے اندر نمایاں ہیں۔ سورہ ذاریات میں سیاق کلام اور ہے اس وجہ سے ہوا کی نرم ردوی کا ذکر بارش کے مقدر کے طور پر آیا ہے۔ یہاں اس کا ذکر مستقلاً ہوا ہے اس وجہ سے یہ رحمت اور نعمت دونوں کو محتمل ہے۔ رحمت کے لیے اس کا محتمل ہونا تو بالکل واضح ہے کہ ہوا کی مردہ جنبانی ہی زندگی اور راحت و نشاط کا ذریعہ ہے لیکن اس کا رحمت یا نعمت بنا کر اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ چاہتا ہے تو بعض اوقات اس کی نرم ردوی کو بھی عذاب بنا دیتا ہے۔ چنانچہ آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت بیان ہوئی ہے جس سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے تند پور بی ہوا کے تصرف سے نجات دی اور اسی ہوا کے سکون کو فرعون اور اس کی فوجوں کی تباہی کا ذریعہ بنا دیا۔

وَالسَّيِّئَاتِ سَبْحًا ۚ فَالسَّيِّئَاتِ سَبْقًا ۚ فَالْمَدَىٰ بَرَاتٍ أَمْدًا (۳-۵)

'سَبْحًا' سے جس کے معنی تیرنے کے بھی آتے ہیں۔ قرینہ اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں یہ بادلوں کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ ادل تو ہواؤں اور بادلوں کا تعلق ہے ہی کچھ لازم و ملزوم سی چیز لیکن ایک واضح قرینہ یہاں یہ ہے کہ اس کے بعد اس کی دو صفتیں جو مذکور ہوئی ہیں وہ 'ف' کے ساتھ مذکور جو عربیت کے قاعدے سے اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ صفتیں سَبْحًا ہی کی ہیں اور ان میں باہم دگر ترتیب بھی ہے۔ اس قاعدے کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے۔

یہاں یہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فَالسَّيِّئَاتِ سَبْقًا ۚ فَالْمَدَىٰ بَرَاتٍ أَمْدًا کے الفاظ میں بادنی تغیر الفاظ وہی بات فرمائی گئی ہے جو سورہ ذاریات میں نَالَجِدِيَّتِ لَيْسًا ۚ فَالْمَقْسِيَّتِ مَلَّيْنَا کے الفاظ میں بادنی کے الفاظ میں اور سورہ مسلات میں قَالْفُرْقَاتِ فُرْقًا ۚ فَالْمَلْكِيَّتِ ذِكْرًا کے لفظوں میں فرمائی گئی ہے۔ مذکورہ سورتوں کی تفسیر میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ یہ بادلوں سے لڑی ہوئی ان ہواؤں کی صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس سرزمین کی طرف چلتی ہیں جس کے لیے حکم ہوتا ہے اور پھر وہ وہ امر الہی کی تقسیم کرتی ہیں یعنی جن کے لیے حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتی ہیں۔ کسی علاقے پر وہ رحمت بن کر برستی ہیں اور کسی کے لیے عذاب بن جاتی ہیں۔ کسی جگہ جل تھل کر دیتی ہیں اور کسی جگہ کو خشک یا تشنہ چھوڑ

جاتی ہیں۔ گویا جو بات سورہ ذاریات میں **فَالْمُقْسِمَاتِ أَمْرًا** کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے وہی بات یہاں **فَالْمَدَّ بَرَاتِ أَمْرًا** کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے۔

اس سے پہلے **فَالسَّبِقَاتِ سُبْقًا** کے الفاظ بادلوں کی اس بھاگ دوڑ کی تصویر پر پیش کر رہے ہیں جو فضا میں اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب ان کے مختلف دستے ایک دوسرے پر سبقت کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب اپنے غیبی حاکم کے حکم کی تعمیل میں سرگرم لگا پڑے ہیں اور ہر ایک اس بات کا آرزو مند ہے کہ اقتتال امر میں اول نمبر اسی کا رہے۔

ان قسموں کا مقسم علیہ یہاں لفظوں میں مذکور نہیں ہے بلکہ محذوف ہے۔ مقسم علیہ کے محذوف ہونے کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ سورہ صی، سورہ ق اور سورہ قیامہ سب میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ مقسم علیہ حذف کر دیا گیا ہے۔ جہاں ذکر کی کوئی خاص ضرورت نہ ہو وہاں حذف ہی اولیٰ ہوتا ہے۔ یہاں چونکہ قیامت کی بلبل کا ذکر آگے تفصیل سے موجود ہے، جو مقسم علیہ کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے، اس وجہ سے اس کے ذکر کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس محذوف کو کھولنا چاہیں تو سورہٴ مرسلات کی روشنی میں **إِنَّمَا تُوَعَّدُونَ تَوَاقِعَ** کے الفاظ یہاں محذوف مان سکتے ہیں۔ گویا تنداد در نرم ہواؤں اور بادلوں کے عجائب تقرنات کو شہادت میں پیش کیے قریش کے متمرین کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ تمہیں جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے اس کو بعینہٴ امکان نہ سمجھو۔ اللہ تعالیٰ جب اس کو لانا چاہے گا تو اس کے لیے کوئی خاص اہتمام اس کو نہیں کرنا پڑے گا۔ اس کی ہواؤں اور اس کے بادلوں کے تقرنات کی جو تاریخ موجود ہے اور جو تمہیں سنائی بھی جا چکی ہے اگر اسی سے سبق حاصل کرو تو وہی تمہارے لیے کافی ہے۔ تم سے کہیں زیادہ طاقتور تو میں اس زمین پر بسی ہیں جن کو خدا نے اپنی ہواؤں ہی کے ذریعہ سے جس ڈخاشاک کی طرح اڑا دیا۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۗ تَتَّبِعُهَا الْمُؤَدَّاتُ (۷۶-۷۷)

یہ مقسم علیہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے گمان کیا ہے، بلکہ اس دن کی یاد دہانی ہے جس دن اس عذاب سے سابقہ پیش آئے گا جس سے ان کو ڈرایا جا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک اس عذاب سے جس سے قیامت کے دن دو چار ہونا پڑے گا۔ دوسرے اس عذاب سے جس سے اسی دنیا میں قوم کو سابقہ پیش آتا ہے۔ اگر وہ اپنے رسول کی تکذیب کر دیتی ہے۔

پہلے آیات ۶-۱۲ میں عذاب قیامت کی تصویر ہے اس کے بعد آیات ۱۴-۱۷ میں اس قیامت کے عذاب کی تاریخی شہادت پیش کی گئی ہے جو تکذیب رسول کے نتیجہ میں اس دنیا میں پیش آتا ہے۔ وہی عذاب قیامت کا ذکر یہاں اس لیے مقدم کر دیا ہے کہ اصل عذاب وہی ہے جس سے ہر ایک کو ہوشیار یاد دہانی

رہنا چاہیے۔ وہ دائمی اور ابدی ہے۔ اس کے ہونے دنیا کا عذاب نہ بھی ہو جب بھی کسی کے لیے کوئی اطمینان کا پہلو نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑا ہتہام ہے کہ وہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر اس دنیا میں بھی عذاب نازل کرتا ہے۔

یہاں 'یوم' سے پہلے فعل محذوف ہے۔ یعنی اس دن کو یاد رکھو یا اس کے ہم معنی کوئی فعل۔ 'نَاجِحَةٌ' کے معنی کپپی اور زلزلہ کے ہیں اور 'رَادِحَةٌ' کے معنی پہلے جھٹکے کے بعد دوسرے جھٹکے کے۔ قیامت کی بلبل، جیسا کہ دوسرے مقامات میں وضاحت ہو چکی ہے، صور کی دو پھونکوں میں مکمل ہوگی۔ یہاں انہی دونوں پھونکوں کے اثرات کی طرف اشارہ ہے۔ مقصود اس سے مکذبین قیامت پر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ قیامت کے ظہور کو بہت مستبعد اور ناممکن نہ سمجھو۔ بس دو جھٹکوں میں یہ سارا نظام درم برہم ہو جائے گا۔

قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِحَةٌ ۗ اَلْبَصَارُهَا خَاشِعَةٌ (۸-۹)

اس دن کا اثر لوگوں کے دلوں پر ہوں گے۔ ان آیات میں اس دن کی بلبل کے وہ اثرات بیان ہوئے ہیں جو اس کائنات میں نمودار ہوں گے۔ فرمایا کہ اس دن کتنے دل ہوں گے جو دھڑک رہے ہوں گے اور ان کی نگاہیں سرسبگی کے سبب سے جھکی ہوئی ہوں گی۔ یہ ان لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے جو اس دن سے نچنت رہے اور جب انہیں اس سے ڈرایا جاتا تو نہایت ڈھٹائی سے اس کا مذاق اڑاتے۔ رہے وہ لوگ جو اس دنیا میں، اس عذاب کو دیکھے بغیر، اس سے ڈرتے رہے وہ، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے، اس دن کی گھبراہٹ سے بالکل محفوظ ہوں گے۔

'اَلْبَصَارُهَا' میں ضمیر کا مرجح 'قُلُوبٌ' ہے۔ آدمی کے اندر دل ہی وہ چیز ہے جس سے اس کی شخصیت عبارت ہے اور جس کی کیفیات کی ترجمانی اس کے بدن کا رواں رواں کرتا ہے۔ خاص طور پر اس کی آنکھ تو وہ چیز ہے جس کے آئینہ میں اس کے دل کی مخفی سے مخفی کیفیت بھی جھلکتی ہے۔ دل کے ساتھ آنکھوں کے اس تعلق کے سبب سے ان کی اصافت دل کی طرف کر دی ہے۔

يَقُولُونَ مَرَانَا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَاخِرَةِ ۗ ؕ اِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۗ قَالُوا
تِلْكَ اِذَا كَدَّۙ خَاسِرَةٌ (۱۰-۱۲)

یہ تصویر ہے ان کے اس مذاق کی جو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کا ذکر سن کر وہ کفار کے استہزاء کی تصویر نہایت بے باکی سے کرتے۔

'حَاسِرَةٌ' کے اصل معنی نقش قدم کے ہیں لیکن مجاورے میں اگر کہیں کہ فلاں رجع علی حاضرتہ ادنی حاضرتہ، تو اس کے معنی ہوں گے کہ فلاں شخص جس حال میں تھا اس سے نکل کر پھر اٹھے پاؤں

اسی میں واپس آ گیا۔

یعنی جب انھیں ڈرایا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد حساب کتاب کے لیے زندہ کیے جاؤ گے تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور ایک دوسرے سے بانڈا بستہ زہرا پوچھتے ہیں کہ کیوں جی! کیا جانے اور بوسیدہ ہڈیاں ہو جانے کے بعد پھر ہم زندگی کی حالت میں لوٹائے جائیں گے!

عَرَاذًا كُنَّا عِنْدَ مَا نَخْرُجُ فِيهِمْ اسْتِفْهَامٌ كَمَا عَادَهُ انْ كِي افزونی حیرت کو ظاہر کرتا ہے کہ اول تو مرنے کے بعد ازبر نوزندہ کیے جانے کا تصور ہی عجیب ہے لیکن اس سے بھی عجیب تر ما جو ایسے کہ جب ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو کر خاک میں مل جائیں گی تب لوگ زندہ کیے جائیں گے! — مطلب یہ ہے کہ بھلا ایسی بعید از عقل و قیاس بات کون مان سکتا ہے!

قَالُوا بَلْآءَ إِذَا كُنَّا خَاسِرِينَ یعنی مذاق اڑاتے کے بعد ذرا سنجیدہ موڈ بنا کر یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ بات جو یہ ملاحظہ کرتے ہیں سچی نکلی تب تو یہ بڑی ہی نامرادی اور بڑے ہی خسارے کا لوٹنا ہو گا! اگرچہ یہ بات سنجیدہ موڈ بنا کر کہتے وہ مذاق ہی کے طور پر لیکن یہ ان کے باطن کی غمازی بھی کرتی ہے کہ قیامت کی تکذیب پر ان کا دل مطمئن نہیں تھا۔ وہ اس کے دلائل کے وزن کو محسوس کرتے اور اس کے انکار کے عواقب سے ڈرتے لیکن زندگی کی لذتوں کو طلاق دے کر ان کی طبیعت ادھر آنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اس خطرے کو ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کرتے اور کہتے کہ قیامت ہوئی تو ہے تو یہ بہت بڑا خطرہ لیکن جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا، ابھی سے اس کی فکر میں اپنے اوپر نیند حرام کیوں کی جائے! یہ امر یہاں واضح رہے کہ بے فکروں کا اصلی فلسفہ یہی ہے جس پر وہ زندگی گزارتے ہیں حالانکہ آخرت کا گمان اگر کسی دوجے میں بھی ہے تو پھر دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی اس کو پیش نظر رکھ کر ہی زندگی گزارے۔

فَإِنَّمَا هِيَ زُجْرَةٌ وَأَحَدَةٌ ۚ فَإِذَا هُمْ بِالنَّارِ هَرَّتْ (۱۳۲-۱۳۱)

یعنی جو سخن سازیاں یہ کرنی چاہتے ہیں کہ لیں اور جتنے محالات پیدا کر سکتے ہیں کر لیں لیکن یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ جب ان کو اٹھانا چاہے گا تو نہ اس کو کوئی استہام کرنا پڑے گا، نہ اس میں ایک لمحہ کی تاخیر واقع ہوگی۔ صرف ایک ہی ڈانٹ میں یہ قبروں سے نکل کر میدانِ حشر میں موجود ہوں گے۔

سَاهِرَةٌ ہموار زمین اور کھلے میدان کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے میدانِ حشر مراد ہے۔ ایک ڈانٹ سے اشارہ یہاں صدر کے دوسرے نفلح کی طرف ہے۔ اس کی وضاحت سورہ زمر میں یوں فرمائی ہے: تَوَفِّيْخَ فِيْهِ اُحْشَوْا۟ فَاِذَا هُمْ قِيَامًا يَنْظُرُوْنَ (الزمر - ۳۹، ۴۰) (پھر اس صور میں دوبارہ پھونک ماری جائے گی تو وہ دفعۃً اٹھ کر تانے لگیں گے۔

هَلْ اَنْتَ حَدِيْثٌ مُّوسٰى ۗ اِذْ نَادٰهُ رَبُّهُ بِالْجَبَّارِ الْمَقْبُوْسِ (۱۵-۱۶)

مکہ میں رسول کے
نتیجہ میں جو خدا
آتا ہے اس کا شہاد

اد پر کے پیرے میں عذاب قیامت کی تصویر تھی۔ اب یہ اس عذاب کی تاریخی شہادت کا حوالہ ہے جس سے رسولوں کے جھٹلانے والوں کو اس دنیا میں سابقہ پیش آیا ہے۔ اس کے لیے حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت کا انتخاب فرمایا ہے جو سب سے زیادہ مشہور و معروف شہادت ہے۔

‘هَلْ أَتَاكَ’ کا سوال محض سرگزشت کی عبرتوں کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے اور واحد کا خطاب

ضروری نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہو بلکہ ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آ رہے ہیں کہ یہ خطاب عام بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سرگزشت کے آخر میں فرمایا بھی ہے کہ (تَنْ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةٌ لِّمَن يَخْشَى) (۲۶) (بے شک اس سرگزشت کے اندر ان لوگوں کے لیے بڑا درس عبرت ہے جو خدا کی گرفت سے ڈرنے والے ہیں)۔

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت حیات کے اس ماجرے کی طرف اشارہ ہے جب وہ مدین سے واپس ہوتے ہوئے طور کے دامن میں پہنچے ہیں اور آگ کی چمک دیکھ کر آگ لینے یا لاتہ معلوم کرنے کے لیے رات کے اندھیرے میں، وادی طوی کی طرف گئے ہیں اور وہاں ان کو ایک درخت سے آواز آئی ہے کہ اے موسیٰ، میں تمہارا رب ہوں۔ میں نے تمہیں ایک کارِ عظیم کے لیے منتخب کیا تو تم فرعون کے پاس میرے رسول کی حیثیت سے جاؤ اور اس کو میرا پیغام پہنچاؤ۔

یہ سرگزشت یہاں چھوٹی چھوٹی کل بارہ آیتوں میں بیان ہوئی ہے لیکن قرآن کے ایجاز بیان کا اعجاز ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رسول ہونے سے لے کر فرعون کے غرق ہونے تک کے سارے مراحل اس میں اس طرح بیان ہو گئے ہیں کہ کوئی ایسا پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے جو مخاطبوں کی سبق آموزی کے لیے ضروری ہو۔

رَاذُھَبِ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی ۗ فَقُلْ هَلْ نَّکَ اِلٰی اَنْ تَسْکُنٰی ۗ وَاھْدِیْکَ
اِلٰی دَبِّکَ فَتَخْشٰی (۱۷-۱۹)

یہ وہ پیغام ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے کر فرعون کے پاس بھیجا۔ فرمایا کہ فرعون کے پاس جاؤ اس نے بہت سراٹھا یا ہے۔ ‘طغی’ سے مراد یہاں اس کے رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کے ساتھ جبارانہ رویہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں کسی کا یہ دعویٰ کہ وہ لوگوں کا رب اعلیٰ ہے سب سے بڑی بغاوت ہے۔ اس بغاوت کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی خاص نند کے ساتھ اس کے پاس بھیجا کہ وہ پہلے اس کو زمی کے ساتھ راہ راست اختیار کرنے کی دعوت دیں، اگر سمجھ جائے تو فہما ورنہ اس کے انجام سے اس کو آگاہ کر دیں۔

‘فَقُلْ هَلْ نَّکَ اِلٰی اَنْ تَسْکُنٰی’ یعنی اس سے کہو کہ کیا تم میں کچھ رغبت پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ہے کہ میں تمہیں اس کا طریقہ بتانے کی کوشش کروں؟ اس فقرے پر غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بیک وقت انتہائی درجے کی نامحازہ شفقت بھی ہے اور ساتھ ہی وہ عظمت و جلالت بھی جو اللہ تعالیٰ یا اس کے سفیر کے

کلام میں ہونی چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک تمھاری جو روش رہی ہے وہ تو یہی باقی ہے کہ تم سے کسی خیر کی توقع نہ رکھی جائے لیکن اللہ تعالیٰ بڑا کریم ہے۔ اب بھی گنجائش ہے کہ اگر تم سلامت روی کی زندگی اختیار کرنے کی رغبت ظاہر کرو تو یہ راستہ تم کو دکھانے کی کوشش کی جائے۔

لفظ تَزَعْتُمْ یہاں وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی خود سہری، انانیت اور ظلم اور جور سے فرعون کو حصول تزکیہ کی دعوت پاک زندگی جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے بندے کی ہوتی ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد لوگوں کے نفوس کا تزکیہ ہی رہا ہے۔ یہ کام انھوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کی آیات کے ذریعہ سے انجام دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ارشاد ہے کہ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ (الجمعة- ۲: ۶۲) (وہی ہے جس نے بھیجا امتوں میں ایک رسول انہی میں سے جو ان کو سنا ہے اس کی آیات اور ان کو پاکیزہ بناتا ہے) اپنے اسی مقصد کا اظہار حضرت موسیٰ نے فرعون کے سامنے فرمایا کہ اگر تم خدائی کے پندار سے ذرا الگ ہو کر اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو تو میں تم کو اللہ کی کچھ باتیں سناؤں۔

فَاَهْدِيكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَقَحْشِي یعنی اس وقت تو تمھارے اوپر اپنی خدائی کا بھوت سوار ہے اس وجہ سے بالکل گمبٹ چل رہے ہو لیکن بات سننے اور سمجھنے کا کچھ شوق ہو تو میں تباؤں کو گھٹا لا اور تمہارا جہاں کا رب کون ہے جس سے سب کو ڈرنا چاہیے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ پاکیزہ زندگی خدا کی خشیت سے اور خدا کی خشیت اس کی صحیح معرفت سے پیدا ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان دو فقروں میں فرعون کو اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی۔

فَأَرْسَلْنَا إِلَيْكَ الْكُتُبَ (۲۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ باتیں چونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے فرمائیں اور ساتھ ہی فرعون کو اس بات سے بھی آگاہ فرمایا کہ وہ اپنے پاس خدا کے رسول ہونے کی سند بھی رکھتے ہیں تو فرعون نے کہا کہ میں تو اپنے سوا کسی اور رب سے واقف نہیں، اگر تمھارے پاس خدا کے رسول ہونے کی کوئی سند ہے تو وہ دکھاؤ۔ اس کے اس مطالبے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بڑی نشانی دکھائی۔ بڑی نشانی سے اشارہ عصا کی نشانی کی طرف ہے۔ اس کو بڑی نشانی سے اس لیے تعبیر فرمایا کہ یہ بیضاء کے سوا ان کے سلاخے معجزات و حقیقت اسی کے اندر مضمون تھے اور اسی کے ذریعہ سے ظاہر ہوئے۔

فَكَذَّبَ وَعَصَىٰ (۲۱)

یعنی اس معجزہ کو دیکھنے کے بعد بھی فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا رسول تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو ساحر اور مفسر ٹھہرایا اور ان کی تکذیب کر دی۔ وَعَصَىٰ، یعنی اس دعوت کو جو آیت ۱۸-۱۹ میں مذکور ہے

میں مذکور ہوئی ماننے سے انکار کر دیا۔

تَعَادَبَدَيْسِي (۲۲)

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بانیں سن کر ہٹا تو ان کو شکست دینے کی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں ان سرگرمیوں کی تفصیل موجود ہے۔ اس نے چاہا کہ جادوگروں سے مقابلہ کرے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو شکست دی جائے لیکن درباریوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے یہ رائے دی کہ یہ دونوں (موسیٰ اور ہارون علیہما السلام) بڑے ماہر جادوگر ہیں، عام جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرنا شکست اور جگہ ہنسائی کا سبب ہو سکتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مملکت کے تمام اطراف کے ماہر جادوگروں کو دعوت دی جائے اور ایک کھلے میدان میں ان دونوں سے ان کا مقابلہ کرایا جائے۔ پچنانچہ اس مشورے پر عمل کیا گیا لیکن اس کا نتیجہ شدید ناکامی کی صورت میں نکلا۔

فَحَشَدْنَا ذِي قَبْلِهِ قَالَ اِنَّا رَبُّكُمْ الْاَعْلٰی (۲۳-۲۴)

یہ فرعون کی اس تدبیر کی طرف اشارہ ہے جو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کے لیے سب سے آخر میں اختیار کی ہے۔ سورہ زخرف سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مصر پر کوئی آفت آئی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کرتا کہ وہ اپنے رب سے دعا کریں کہ یہ بلا ٹل جائے، اگر ان کی دعا سے یہ بلا ٹل گئی تو وہ ان کا مطالبہ ضرور تسلیم کر لے گا لیکن جب وہ بلا ٹل جاتی تو وہ پھر اپنے وعدے سے مکر جاتا۔ اس کی بار بار اس روش کا اثر یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سچائی کا اثر خود قبضیوں میں بہت بڑھنے لگا۔ اس سے گھبرا کر فرعون نے قوم کے تمام بااثر افراد کو جمع کیا اور ان کے اندر اپنا اثر بحال کرنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر اس نے جو تقریر کی اسی کی طرف یہاں اجمالی اشارہ ہے۔ اس کی تفصیل سورہ زخرف میں ہے:

اور فرعون نے اپنی قوم میں پکارا کہ کیا مصر کی بادشاہی اور یہ نرسیں جو میرے نیچے جاری ہیں، میرے لیے نہیں ہیں؟ کیا تم لوگ دیکھ نہیں رہے ہو؟ تو یہ بہتر ہوا یا میں اس سے بہتر ہوں جو ایک حقیر آدمی ہے اور اپنی بات کھل کر کہہ بھی نہیں سکتا؟ اگر یہ خدا کا رسول ہے، تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس پر سونے کے گنگن اتارے جلتے یا اس کے ساتھ فرشتے پرے باندھ کر آتے؟ ان باتوں سے

وَنَادَى فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ
يَعُوذُونَ بِي مَلِكٍ مِّمَّو
هَذِهِ اِلَّا نَهْتَجِرُكَ مِنْ تَحْتِي
اَفَلَا تَبْصُرُونَ اَمْرًا نَاخِيًا مِنْ
هَذَا الَّذِي هُوَ مِهِنٌ وَلَا يَكَادُ
يُبِينُ هَ فَلَولا اَلْفِي عَلَيْهِ اَسْوَدَةٌ
مِنْ ذَهَبٍ اَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلِكُ
مُقْتَرِبِينَ هَ فَاَسْتَحَفَّ قَوْمَهُ
فَاَطَاعُوهُ هَ اِنَّهُمْ كَانُوا

تَوَمَّأَ فُتِقِينَ ۚ فَلَمَّا أَسْفُونَا
 اتَّقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَعَدُّ قُهُمُ
 أَجْمَعِينَ ۝
 (الزخرف - ۵۱۲-۵۵)

اس نے اپنی قوم کی بے وقوف بنالیا اور وہ
 تھے ہی نافرمان لوگ۔ توجب انہوں نے ہم
 کو غصہ دلا دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا پس
 ان سب کو فرق کر دیا۔

فَاخَذَ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَى (۲۵)

نکال کے معنی عبرت انگیز عذاب کے ہیں۔ یعنی جب اس نے سب کچھ دیکھا اور سن لینے کے بعد
 بھی اپنی سرکشی ہی پر اصرار کیا تو اللہ نے اس کو آخرت اور دنیا دونوں کے عذاب میں پکڑا۔ دنیا میں وہ سمندر
 کی موجوں کے سوار ہوا اور آخرت میں جہنم کے عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔
 إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَخْشَى (۲۶)

یہ وہ مقصد بیان ہوا ہے جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی گئی ہے۔ فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کے لیے
 بڑا درس عبرت ہے جو خدا کی پکڑ سے ڈرنے والے ہوں۔ بات اگرچہ عام صیغہ سے فرمائی گئی ہے لیکن
 اشارہ خاص طور پر قریش کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے اندر کچھ خوف خدا ہے تو وہ اس سے سبق
 حاصل کریں اور دانش مند رہیں جو دوسروں کے انجام سے سبق حاصل کرے نہ کہ خود اپنے اوپر سیلاب بلا
 گزر جانے کا انتظار کرے۔

مَا أَنْتُمْ أَشَدَّ خَلْقًا أَمْ لَسْنَا بِمُنْهًا (۲۷)

اب آگے کی سات آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور ربوبیت کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی آسمان وزمین
 ہے جو آسمان وزمین کے ہر گوشے میں پھیلی ہوئی ہیں اور اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اس دنیا کا خالق ایسی
 عظیم قدرت والا ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا کام بھی اس کے لیے مشکل نہیں ہے۔ جب وہ آسمان جیسی عظیم
 چیز کو پیدا کر سکتا ہے تو لوگوں کے مکھپ جانے کے بعد ان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اس کے لیے کیا دشوار
 ہے؛ اسی طرح آسمان سے لے کر زمین تک اپنی ربوبیت کا جو اہتمام اس نے پھیلا رکھا ہے وہ اس بات
 کا شاہد ہے کہ وہ لوگوں کو غیر مسئول نہیں چھوڑے گا بلکہ ایک دن لازماً سب کو اکٹھا کرے گا اور یہ
 دیکھے گا کہ کس نے اس کی نعمتوں کا حق پہنچا نا اور کس نے ناشکری کی اور پھر ان کے اعمال کے مطابق ان
 کو جزایا سزا دے گا۔ گریا منکرین قیامت کے جس شبہے کا آیات ۱۰-۱۲ میں جو الہ دیا گیا ہے اس کا جواب
 بھی دے دیا گیا اور ساتھ ہی قیامت کی ضرورت اور حکمت بھی واضح فرما دی گئی ہے۔

مَا أَنْتُمْ أَشَدَّ خَلْقًا أَمْ لَسْنَا بِمُنْهًا فرمایا کہ اگر تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ مرنے اور
 پڑیوں کے بوسیدہ ہر جانے کے بعد تم دوبارہ کس طرح زندہ کیے جاسکتے ہو تو سوچو کہ یہ عظیم آسمان جو تمہارے
 سروں پر پھیلا ہوا ہے، اس کو پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا تمہارا پیدا کیا جانا؛ اگر اس کا مناسبت کا خالق

اس آسمان کے بنانے پر قادر ہو سکتا ہے تو دوسرا کون سا کام ہے جو اس سے زیادہ مشکل ہے کہ وہ اس پر قادر نہ ہو سکے گا!

رَفَعَ سَمَكُهَا فَسَوَّيْتَهَا ۙ وَاعْطَشَ لَيْلَهَا دَاخِرًا صُحْبَهَا (۲۸-۲۹)

یہ آسمان کے اندر خدا کی عظیم قدرت و حکمت کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے تاکہ جو لوگ دوبارہ پیدا کیے جانے کو بعید از امکان سمجھ رہے ہیں وہ غور کریں کہ جس خدا کی قدرت کی یہ شانیں وہ ہر وقت دیکھ رہے ہیں اس کے لیے کسی کام کے ناممکن ہونے کا کیا سوال؟

’سَمَكٌ‘ کے معنی چھت کے ہیں۔ فرمایا کہ اس نے آسمان کو بنایا، اس کی چھت کو بلند کیا اور پھر اس کو اس طرح ہموار کیا کہ کسی کے امکان میں نہیں کہ اس کے کسی کونے میں کسی غلطی کی نشاندہی کر سکے۔

دَاْعَطَشَ لَيْلَهَا دَاخِرًا یعنی پہلے اس کے اندر رات ہی رات تھی۔ وہ ہمیشہ کہ سورہٴ حٰجَّہ السجدة میں اشارہ ہے، دھوئیں کی شکل میں تھا۔ لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی رات ڈھانک دی۔ اس کے حصہ کی روشنی نمودار کی، رات اور دن دونوں کو ایک نظام کا پابند بنا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ جو خدا اس جہاں پر رات طاری کر دینے پر قادر ہے، کیا اس کے لیے دنیا کے مکھپ جانے کے بعد اس کو دوبارہ پیدا کرنا ناممکن ہو جائے گا؟ زیادہ مشکل پہلا کام ہے یا دوسرا؟

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَخَلَهَا ۙ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءً ۙ وَاصْرَعَهَا ۙ وَالْجِبَالَ اَرْسَهَا ۙ مَآءًا تَسْكُمُ ۙ وَاِلَّا نَعَا مِكُمْ (۳۰-۳۳)

آسمان کی نشانیوں کے بعد یہ زمین اور اس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی اور مقصود اس سے بھی جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، خدا کی قدرت اور اس کی پروردگاری کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جس خدا نے زمین کو ہمارے لیے بچھپایا، اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا، اس کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے اس کے اندر پہاڑوں کو گاڑا، کیا تم کو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا؟ جب اس نے یہ سارے کام کیے اور اس کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تو ایک اپنی ہی پیدا کی ہوئی مخلوق کو دوبارہ پیدا کر دینا کیوں دشوار ہو جائے گا!

’مَآءًا تَسْكُمُ ۙ وَاِلَّا نَعَا مِكُمْ‘ اس ربوبیت کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس زمین کے چپے چپے پر نمایاں ہے۔ فرمایا کہ دیکھو تو معلوم ہو گا کہ تمہارے رب نے صرف تمہاری ہی ضرورت کا سامان نہیں کیا ہے بلکہ تمہاری خدمت کے لیے چوپائے پیدا کیے ہیں، ان کی مایحتاج کا بھی پورا انتظام فرمایا ہے۔ اب غور کرو کہ جس پروردگار نے تمہاری پرورش کے لیے آسمان سے لے کر زمین تک یہ اہتمام فرمایا ہے کیا اس نے تمہیں محض اس لیے پیدا کیا ہے کہ کچھ عرصہ تک اس زمین میں کھاؤ پیو اور ایک دن ختم ہو جاؤ؟ اس سے اس کو کچھ بحث نہیں کہ تم میں سے کس نے نیکی کی زندگی بسر کی اور کس نے بدی کی؟ کس نے اپنے رب کی نعمتوں کا

حق پہچانا اور کس نے اندھے بہرے میں کی زندگی گزارا؟

غور کرو تو معلوم ہوگا کہ یہ مفروضہ بالکل باطل ہے۔ یہ مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ یہ دنیا محض ایک بازیچہ اطفال ہے۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ العیاذ باللہ اس کا خالق حکیم نہیں، بلکہ ایک کھنڈ راہے جس کے نزدیک نیکی اور بدی میں کوئی امتیاز سرے سے ہے ہی نہیں۔ غور کیجئے کہ کیا اس کائنات کے عظیم خالق کے متعلق ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور کیا جاسکتا ہے!

وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا، کے الفاظ سے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زمین کی خلقت آسمان کے بعد ہوئی ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ حَسْبُ السَّجْدَةِ کی آیت ۱۱ میں زمین اور اس کی بعض اہم نشانیوں کی تخلیق کے بعد فرمایا ہے کہ نَحْنُ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ (پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی اور وہ اس وقت دھوئیں کی شکل میں تھا) جس سے یہ گمان گزرتا ہے کہ آسمان کی تخلیق زمین کے بعد ہوئی ہے۔ اس سوال کا جواب ہم حَسْبُ السَّجْدَةِ کی مذکورہ آیت کے تحت دے چکے ہیں۔ براہ کرم اس پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

یہاں اجمالاً صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ قرآن نے آسمان اور زمین کی تعمیر سے متعلق جو تصور دیا ہے وہ ایک مکان کی صورت میں دیا ہے جس میں آسمان کی حیثیت چھت کی اور زمین کی حیثیت فرش کی ہے کسی مکان کا نقشہ جب بنایا جاتا ہے تو اس میں چھت اور فرش دونوں بیک وقت مد نظر ہوتے ہیں اور دونوں کا خاکہ ایک ہی ساتھ تیار کر لیا جاتا ہے لیکن تعمیر کے مختلف مراحل میں کبھی فرش اور اس کے متعلقات پر کام ہوتا ہے اور کبھی چھت اور اس کے اطراف پر۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلے آسمان پیدا ہوا یا زمین۔ سورہ حَسْبُ السَّجْدَةِ میں اگرچہ باؤل و ملہ ذہن اس طرف جاتا ہے کہ پہلے زمین کی تخلیق ہوئی لیکن ساتھ ہی اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جب خالق نے آسمان کی تعمیر کا قصد فرمایا تو وہ دھوئیں (یا سانس فاتوں کی اصطلاح میں سمجھیے کی شکل میں) موجود تھا۔ اسی طرح یہاں زیر بحث آیت میں اگرچہ متبادر ہی ہوتا ہے کہ آسمان پہلے وجود میں آیا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ ایک خاص مرحلہ تعمیر کی بات ہو جس کے بعد زمین کی تعمیر کا آخری مرحلہ (یعنی اس کا بچھا یا جانا) عمل میں آیا ہو۔ اس عظیم اور ناپیدا کنار کائنات کی تعمیر کا معاملہ ایسا نہیں ہے جو ہماری محدود عقل کی گرفت میں آسکے۔ اس کے تمام مراحل کا احاطہ اللہ تعالیٰ کا محیط کل علم ہی کر سکتا ہے۔

فَإِذَا جَاءَتْ النَّظَامَةُ الْكُبْرَىٰ (۳۴)

النَّظَامَةُ الْكُبْرَىٰ کے معنی بڑی بلبل اور بڑے ہنگامہ کے ہیں۔ مراد اس سے قیامت ہے۔ اس کے بعد اس شرط کا جواب بر بنائے قرینہ مجذوف ہے۔ اس طرح کے حذف کی مثالیں چھپے گزر چکی ہیں اور اس کی بلاغت بھی ہم واضح کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ بڑا ہنگامہ ہوگا تو یہ

آسمان وزمین سب درہم برہم ہو جائیں گے۔

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعَىٰ (۳۵)

یہ 'یَوْمَ' جو اب شرط محذوف کا ظرف ہے جس طرح آیت ۶ میں 'یَوْمَ' مقسم علیہ محذوف کا ظرف ہے۔ یعنی اس دن انسان اپنے کیسے کو یاد کرے گا۔ آج تو اس کو غفلت کی سرستی میں کچھ ہوش نہیں کہ وہ کیا بنا رہا ہے، جب اس کو اس دن سے ڈرایا جاتا ہے تو اس کا مذاق اڑاتا ہے، لیکن اس دن اس کو ہوش آئے گا اور وہ دیکھے گا کہ وہ دنیا میں کیا کمائی کر کے آیا ہے۔

وَبُودَّتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرَىٰ (۱۶)

آج تو اسے آخرت اور جہنم بہت بعید از امکان نظر آتی ہے لیکن اس دن جہنم ان لوگوں کے لیے بے نقاب کر دی جائے گی جن کو اس سے دوچار ہونا ہے۔ بے نقاب کر دی جائے گی، یعنی وہ بالکل تیار ہے۔ بس پردہ اٹھنے کی دیر ہے۔ پردہ اٹھتے ہی وہ ان سب کے سامنے ہوگی جو اس کو آنکھوں دیکھے بغیر ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

جہنم تیار ہے

مرن پرندہ

اٹھنے کی دیر ہے

'لِمَنْ يَّرَىٰ' یعنی جن کے لیے، ان کے اعمال کی پاداش میں، اس کا دیکھنا مقدر ہے وہ اس کو دیکھیں گے۔ رہے اللہ کے وہ بندے جو بن دیکھے ہی اس سے لرزاں و ترساں رہے ہیں اللہ ان کو اس سے دور رکھے گا۔ وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغَىٰ ؕ وَاَشْرَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ فَانَ الْجَحِيْمِ هِيَ الْمَا دِي (۳۹-۳۸)

فرمایا کہ جس نے اس دنیا میں سرکشی کی ہوگی اور دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہوگی اس دن اس کا ٹھکانا بس جہنم ہی بنے گی جس سے اس کو کبھی نکلتا نصیب نہ ہوگا۔ سچھے آیت، ا میں فرعون کے طغیان کا ذکر گزر چکا ہے یہاں 'اَشْرَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا' سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اس طغیان میں وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو آخرت کو نظر انداز کر کے اسی دنیا کے سچاری بن جاتے ہیں، اس سے الگ ہو کر وہ کسی چیز کو سوچتے اور ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔

فَاِنَّ الْجَحِيْمِ هِيَ الْمَا دِي میں حصر کا مضمون ہے یعنی پھر ان کے لیے جہنم ہی جہنم ہے کوئی اور راہ ان کے لیے کھلنے والی نہیں ہے۔

دَا مًا مِّنْ حَا فٍ مَّقَامٍ رَبِّهٖ وَتَهَى النَّفْسِ عَنِ الْهَوٰى ؕ فَاِنَّ الْبَغْيَةَ هِيَ الْمَا دِي (۴۱-۴۰)

البتہ وہ لوگ جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرتے رہے اور دنیا کے سچھے بھاگنے کے بجائے جنموں نے اپنے نفس کو خواہشوں کی پیروی سے روکا تو ان کا ٹھکانا بس جنت ہی ہوگی وہ اس سے کبھی محروم نہ ہوں گے۔

مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ ۖ سَعَىٰ مَرَادِ خَدِّكَ حَضْرًا ۖ بِشِيءٍ سَعَىٰ ۖ ذُرْنَاهُ ۖ سَعَىٰ ۖ سُوْرَةُ مَطْفُفِيْنَ ۖ فِيْ اِسْ كِي

وضاحت یوں آئی ہے:

اَلَا يَكْفُرُ اُدْلِيْكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْدُوْنَ ۙ
رَبُّوْمِ عَظِيْمٍ ۙ كَيْوَمَ يَفْقُوْمُ النَّاسَ
رَبِّبِ الْعٰلَمِيْنَ ۙ
(المطففين - ۸۳: ۴ - ۶)

کیا وہ یہ گمان نہیں رکھتے کہ وہ ایک بھاری
دن کی عافری کے لیے اٹھائے جانے والے
ہیں؟ جس دن لوگ خداوندِ عالم کے حضور
پیشی کے لیے اٹھیں گے!

اسی پیشی کا ڈر ہے جو انسان کو خواہشوں کی پیروی سے روکتا ہے۔ یہ ڈر نہ ہونو نفس کو خواہشوں

کے پیچھے بھاگنے سے کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

كَيْسَلُوْنَاكَ عَنِ الْمُبَاعَاةِ اٰيٰتٍ مُّرْسَلٰهَا (۴۲)

یہ اور اس کے بعد خاتمہ سورہ کی آیات ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تم ان
لوگوں کی پروا نہ کرو جو تمہیں زچ کرنے کے لیے قیامت کے ظہور کا وقت پوچھتے ہیں۔ تمہارا کام اس سے
لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے تاکہ جو مستتب ہونا چاہیں وہ متنبہ ہو جائیں۔ رہے وہ جو اس کو دیکھ کر ماننا چاہتے
ہیں اور اس کے ظہور کا وقت معلوم کرنے کے درپے ہیں ان کو مطمئن کرنا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ
انہوں نے محض اس کی تکذیب کے لیے ایک بہانہ بنایا ہے۔

اٰيٰتٍ مُّرْسَلٰهَا، یعنی یہ اس کے ظہور کے وقت سے متعلق سوال کرتے ہیں۔ اٰيٰتٍ، وقتِ مستقبل

سے متعلق سوال کے لیے آتا ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ میرے نزدیک کہاں، صحیح نہیں ہوگا بلکہ کب
ہونا چاہیے۔

مُرسَلٰی کے معنی لنگر انداز ہونے کے ہیں۔ اس لفظ میں یہاں ایک قسم کا طنز مضمر ہے۔ یعنی یہ منکرین
پوچھتے ہیں کہ ہم کب سے یہ خبر سن رہے ہیں کہ بس قیامت آیا ہی چاہتی ہے لیکن اس کو نہ آنا تھا نہ آئی۔
آخر اس کا سفینہ ہمارے ساحل میں کب لنگر انداز ہوگا! اس کے انتظار میں تو ہماری آنکھیں پتھر اگئیں!
رَبِّمِ اَنْتَ مِنْ ذِكْرِهَا ۗ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا (۴۳ - ۴۴)

فرمایا کہ تمہیں اس سبب سے کیا تعلق؟ اس کا سرا تو صرف تمہارے رب کے پاس ہے۔ تم ان
لوگوں کو یہ بتانے نہیں آئے ہو کہ قیامت کس دن آئے گی؟ اس کا علم تمہارے رب کے سوا اور کسی کے
پاس نہیں ہے تو جو سوال ہر سے تم سے متعلق ہے ہی نہیں تمہیں اس سے کیا واسطہ اور تم اس کی
کھوج کرید میں کیوں پڑو! اس کو اللہ کے حوالہ کرو جو اس کا حقیقی علم رکھنے والا ہے۔

اِنَّمَا اَنْتَ مُبْذِرٌ مِّنْ يَّخْشٰهَا (۴۵)

جو لوگ قیامت کو دیکھ کر اس کو ماننا چاہتے ہیں ان کی ذمہ داری تمہارے اوپر نہیں ہے۔ ان کو

ان کے حال پر چھوڑ دو تمہارا انداز صرف انہی پر کارگر ہوگا جو دلائل کی روشنی میں اس کو بن دیکھے ماننے اور اس سے ڈرنے کے لیے تیار ہوں۔

كَانَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَدُّونَهَا لَكُم يَأْتُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا (۴۶)

یعنی آج اگر ان کو یہ دکھائی نہیں جاتی یا اس کی تاریخ نہیں مقرر کی جاتی تو اس منظر میں نہ رہیں کہ وہ اتنی دور رہے کہ اس کے لیے انھیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس دن اس کو دیکھیں گے اس دن کا احساس یہ ہوگا کہ گویا دنیا میں وہ ایک دن کے پچھلے یا اس کے پہلے پہر سے زیادہ نہیں رہے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَاللّٰهُ الْحَمْدُ
اَوَّلًا وَاٰخِرًا۔

رحمان آباد

۲۷ اپریل ۱۹۷۹ء

۲۹ جمادی الاول ۱۳۹۹ھ